عبدالرشید ارشد
جوہر آباد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
یادوں کے آئینے میں

نقیبِ ختم نبوت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا اور اتنے اچھے لکھنے والوں نے لکھا کہ میرے جیسے طالب علم کے لیے یہ جسارت محض طفلانہ حرکت محسوس ہوتی ہے مگر یہ جاننے کے باوجود جسارت صرف اس لیے ہے کہ سید کے چاہنے والوں کی فہرست میں شاید آخری نام میرا بھی شامل ہو جائے اور اللہ رب العزت کے اس وعدہ پر کہ میں چاہنے والوں کو اکٹھا کر دوں گا۔ ابدی زندگی میں ان کا قرب نصیب ہو جائے۔

میرے والد محترم مجلس احرار اسلام میں شامل تھے اور یوں گھر میں کم وبیش ہر روز کسی نہ کسی انداز میں احرار کے جلسوں کا، احرار کے رہنماؤں کا ذکر ہوتا تھا۔ جس میں نمایاں تذکرہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہوتا تھا۔ اس ماحول میں' میں نے ہوش سنبھالا۔ ہمارا قصبہ ٹانڈہ' جالندھر سے ۲۵ میل دور تھا مگر ضلع ہوشیار پور کی تحصیل دسوہہ کا حصہ تھا۔ شاہ صاحب محترم جب بھی اس علاقے میں یعنی جالندھر یا لائل پور (فیصل آباد) تشریف لاتے تو والد صاحب اُن کی تقریر سننے ضرور تشریف لے جاتے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے میرا خاندان فیصل آباد میں آباد ہو گیا۔ ہجرت کے لگے زخم بمشکل ۱۹۴۸ء کے آخر تک مندمل ہو سکے تو والد صاحب نے اپنی دینی سرگرمیوں میں شمولیت اختیار کر لی۔ یوں مجلس احرار اسلام سے رابطہ بحال رہا۔

۱۹۵۳ء میں احرار نے تحریک تحفظ ختم نبوت کا آغاز کیا۔ میں لاہور کالج آف اینمل سینڈری میں B.V.Sc کا طالب علم تھا۔ مارچ میں گھر چھٹی پر آیا ہوا تھا کہ ایک جمعہ پڑھنے کچہری بازار لائل پور میں مرکزی جامع مسجد میں چلا گیا۔ خطبہ شانِ رسالت پر تھا اور بعد ازاں اعلان ہوا کہ بعد از نماز احرار کا ایک جیش تحریک میں حصہ لینے کے لیے لاہور روانہ ہوگا۔ ۴۰ افراد کا دوسرا جیش کل صبح لاہور جائے گا۔ نماز کے بعد جیش کی روانگی کا منظر خاصا جذباتی اور روح پرور تھا۔ لہٰذا میں نے بھی دل میں تہیہ کر لیا کہ کل میں بھی شامل ہوں گا۔ میں گھر گیا اور والد صاحب سے اجازت لی۔ دوسرے دن جیش میں شامل ہو کر لائل پور سے مولانا تاج محمودؒ کی قیادت میں روانہ ہو گئے تو پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتے رات کو مسجد وزیر خان پہنچ گئے۔ مسجد میں مولانا عبدالستار خان نیازیؒ رضا کاروں کا خون گرماتے۔ ہر صبح مسجد سے احتجاجی جیش نکلتے' پولیس کی مار کھاتے، ہڈیاں سہلاتے۔ کچھ واپس آتے تو کچھ منزل پا کر اپنے سرخ لہو سے خیابانِ ختم نبوت کو سینچتے۔ اس طرح کے ایک شہید کی میت پر رات بھر پہرہ دینے کی سعادت میرے حصے بھی آئی۔

پاکستان کا پہلا مارشل لاء لگا۔فوج آئی تو اب مقابلے میں پولیس اور فوج تھی۔مسجد وزیر خان کے گرد گھیرا تنگ ہوگیا۔رضا کاروں کا کھانا اٹھالیا گیا،بجلی کاٹ دی گئی اور پانی بند کردیا گیا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ لاہور میں بھی ایک کربلا سجنے والا ہے کہ مسجد کے چاروں جانب اونچی عمارات کی چھتوں پر فوجی برین گنیں سیٹ کیے مسجد کا نشانہ لیے بیٹھے تھے کہ حکم ملے تو مسجد کے صحن کو خون کے تالاب میں تبدیل کردیں۔ادھر رضا کاران مسجد کی چھت پر اینٹ روڑے سے ''مسلح'' مقابلے کے لیے تیار تھے۔پولیس سے چھینی دو رائفلیں اور مرحوم ڈی ایس پی فردوس شاہ کا ریوالور بصورت ''آتشیں اسلحہ'' ان کا مقدر تھا۔

۶/مارچ ۱۹۵۳ء کو فوج نے مسجد وزیر خان سے ۶۱۰ رضا کاران کو گرفتار کر کے رات کی تاریکی میں ٹرک بھرے اور شہر کا چکر لگا کر بورسٹل جیل میں لا ڈالا۔رضا کاران کی تلاشی ہوئی۔ہر چیز چھین لی گئی۔چند نوجوان بچوں کا راشن بچانے میں کامیاب ہوئے جو کوٹھڑیوں میں ساتھ لے گئے اور بعد میں یہ چنے بہت بڑا سہارا ثابت ہوئے کہ ۲۶ دن ان رضا کاران کو دو آدھ جلی چپاتیاں دونوں وقت ملتیں۔جن کا ''قابل کھا'' صرف ایک تہائی حصہ ہوتا جو زندہ رہنے کے لیے تو کافی تھا مگر سیدھا کھڑا ہونے یا چلنے پھرنے کے لیے انتہائی ناکافی کیونکہ خود راقم الحروف کو کھڑے ہوتے ہی ''تارے گھومتے'' نظر آتے تھے۔

۲۶ دن کے بعد کورٹ مارشل ہوا۔دو سطری ایک چٹ پر چارج شیٹ،مدعی ایک صوبیدار اور جج بلوچ رجمنٹ کے میجر انور نے ہلدی لگے نہ پھٹکری انصاف ہر حوالاتی پر نچھاور کرتے' کسی کو ۶ ماہ،کسی کو ۱۱ ماہ اور کسی کو ایک سال قید بامشقت سناتے سنٹرل جیل لاہور (موجودہ شادمان کالونی) بھیج کر بورسٹل جیل خالی کردی۔قیدی کہلوانے والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ کھانے کو دو روٹیاں ملنے لگیں جو بورسٹل جیل سے بہرحال بہتر تھیں۔یہاں مونج کی بٹائی مقدر بنی۔جو ایک کلو مونج دے کر چودہ چھٹانک رسی لینے کی شرط پر تھی۔جسے چار ماہ تک میں نے ''سپیشلائیزیشن'' کے حوالے سے ''انجوائے'' کیا۔

رشوت سے اجتناب ضروری کہ اس پر جہنم کی وعید ہے مگر سفارش آور وہ بھی بے ضرر جس سے کسی کا حق تلف نہ ہو۔میری خواہش کے بغیر میرے پیچھے جیل پہنچ گئی کہ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ شیخ فرحت مجھے تلاش کرتے آئے کہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند لگتے تھے۔انہوں نے میرا نام پوچھا اور ساتھ ہی مونج سے آزادی کا اعلان کرتے کلرک بنادیا۔جس کے سبب مجھے جیل میں ہر سو گھومنے پھرنے کی آزادی ہوگئی۔بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کا پروموشن کا کیس تھا اور اُن سے صرف یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ ''اندر'' ہمارا بندہ خوش رہنا چاہیے۔حالاں کہ میں مونج بٹتے بھی خوش تھا۔آزادی بہرحال خوشی میں اضافہ کرنے والی تھی مگر ساتھ کچھ دکھی کرنے والی بھی کہ پھانسی کوٹھڑیوں میں بند موت کے منتظر قیدیوں کی ''اُڑدی'' (کوٹھڑیاں صبح وشام بدلنے) کے لیے وہاں جا کر اُن کے دکھ میں شریک ہونا ہوتا تھا۔

اس آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے سب سے پہلے میں نے دیوانی گھر کا رخ کیا جہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

اور احرار کے دوسرے رہنما نظر بند تھے۔ایک صبح میں اس وقت دیوانی گھر میں داخل ہوا جب احرار کی مرکزی قیادت دسترخوان پر ناشتے میں مصروف تھی۔میرے سلام کا جواب دیتے ہی محترم سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھے اپنے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی۔میں بیٹھ گیا تو ہلکا سا تعارف پوچھا۔شفقت سے میری کمر پر ہاتھ پھیرتے حوصلہ سے قید کاٹنے کی نصیحت کے ساتھ بڑی محبت سے میرے منہ میں چند لقمے اپنے ہاتھ سے ڈالے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیالی میرے سامنے رکھی۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

آج ۵۱ سال بعد جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو کمر پر سید مرحوم کے ہاتھ کا لمس، اُن کے ہاتھ سے حلق میں اترے چند نوالے اور چائے کی پیالی قیمتی اثاثہ نظر آتی ہے۔دسترخوان پر زعمائے احرار کی بات چیت جاری تھی۔ایک صاحب فرما رہے تھے کہ ہمیں معذرت کر کے جیل سے نکلنا چاہیے تاکہ باہر جا کر تحریک میں جان ڈالی جا سکے۔جب کہ اکثریت اس رائے کو مسترد کر رہی تھی اور میں اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو معذرت کر کے باہر نکل جائیں گے لیکن شہداء کے خون کا حساب کون چکائے گا اور کیا عوام معذرت کرنے والے رہنماؤں کو قبول کر لیں گے؟ اس حال میں سید محترم کا عزم چٹان کی طرح پختہ دیکھا گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے مجھے حوصلہ دلاتے ماضی کا ایک واقعہ سنایا۔فرمانے لگے: ایک بار مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خان بھی تمہاری عمر میں پہلی بار جیل آئے تھے۔ہم یہاں علمی ادبی مجلسیں سجاتے تھے۔ایک روز اختر علی خان کہنے لگے: شاہ صاحب! اپنی غزل سناؤں؟ میں نے کہا ضرور سناؤ۔جب غزل شروع کی تو میں جان گیا کہ غزل کس کی ہے مگر اس کے باوجود ہر مصرعے پر خوب داد دی۔آخر میں جب شاعر کے نام والا مصرعہ آیا تو اختر جھجک گیا۔میں نے کہا لگا دو اپنا نام۔تو محفل کشتِ زعفران بن گئی مگر اختر مرجھا گیا۔پھر اسے حوصلہ دلایا کہ اس عمر میں ایسا ہوتا ہی ہے، غم نہ کرو۔

شاہ صاحب محترم نے اپنا ایک اور واقعہ سنایا کہ انگریز بہادر نے مجھ سے نجات حاصل کرنے کی خاطر بغاوت کا مقدمہ بنوانے کی سازش کی۔مجھے جیل میں ڈال دیا گیا۔ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ عطاء اللہ! یہ تمہیں پھانسی لٹکانے کا سوچ رہے ہیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت تمہارا دل گھبرائے چلو کسی روز پھانسی کا تختہ وغیرہ دیکھ تو لو۔ایک روز موقع مل گیا اور میں تختہ دار پر پہنچ گیا۔تختہ پر کھڑا ہو کر اوپر دیکھا کہ یہاں رسہ ہوگا جو گلے میں یہاں فٹ ہوگا۔پھر جلاد اس لیور کو کھینچے گا تو جھٹکے سے گرتے ہی گردن کا منکا ٹوٹ کر اس دنیا سے رشتہ توڑ دے گا۔بس اتنا سا تو مسئلہ ہے دل مطمئن ہو گیا۔مگر انگریز ہار گیا کیونکہ لدھا رام کا ضمیر جیت چکا تھا کہ اس نے بھری عدالت میں سچ کی گواہی دی جو مسلمان دیتے گھبراتے تھے۔میں جیل سے باہر آ گیا اور لدھا رام اندر چلا گیا۔

شاہ صاحبؒ کی کس کس بات کا تذکرہ کروں۔قرآن کی تلاوت فرماتے تو بلا مبالغہ یوں محسوس ہوتا کہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔سامعین مسحور ہو جاتے اور ہر دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی کہ یہ تلاوت ہی کرتے رہیں۔ہوشیار پور

جب بھی جلسہ ہوتا۔شاہ صاحب کی آمد کا سن کر ایک سکھ آٹھ دس میل پیدل چل کر جلسہ میں ضرور پہنچتا۔کسی نے سوال کیا کہ سردار جی! جلسہ تو مسلمانوں کا ہوتا ہے۔آپ کیا لینے جاتے ہیں؟ سردار کہنے لگا: وہاں ایک نورانی چہرے والا بابا آتا ہے میں صرف اس کا قرآن سننے جاتا ہوں۔تلاوتِ قرآن ہی کے ضمن میں ایک اور روایت ہے کہ ایک بار جیل میں گئے تو ان کی کوٹھری جیل کے اس حصے میں بیرونی دیوار کے ساتھ تھی جہاں دوسری طرف ہندو سپرنٹنڈنٹ جیل کی کوٹھی تھی۔شاہ صاحب کا معمول تھا کہ وہ سحر کے وقت باآواز بلند وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا کا حق ادا کرتے۔لحن داؤدی کی مثال قائم کرتے،تلاوت فرماتے تھے۔جونہی آپ تلاوت کرتے ہندو سپرنٹنڈنٹ کی بیگم رونا شروع کر دیتی۔چار چھے دن کے بعد جب سپرنٹنڈنٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا رونا شاہ صاحب کی تلاوت کا ردِّعمل ہے تو شاہ صاحب کو دفتر میں بلا کر کہنے لگا کہ آپ صبح تلاوت کرتے ہیں تو میری بیوی رونا شروع کر دیتی ہے۔لہٰذا آپ تلاوت نہ کیا کریں۔شاہ صاحب نے فرمایا کہ تلاوت تو میرے رب کا حکم ہے،میرے رب کا کلام ہے بند نہیں ہوسکتی۔لہٰذا تم اپنی بیگم کا علاج کراؤ۔پھر شاہ صاحب نے اس کی عاجزانہ استدعا کے جواب میں خود ہی نسخہ تجویز فرمایا کہ میری کوٹھری جیل کے دوسرے حصے میں طے کر دو جہاں سے آواز نہ آئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سطحی قسم کے عوامی لیڈر نہ تھے۔قرآن وسنت پر عامل رہنما تھے اور اسی وجہ سے نڈر بھی تھے،حق گو تھے،لوگ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فرنگی اور فرنگی کے فرزند مرزا قادیانی کے دشمن تھے۔بلاشبہ وہ اُن کے دشمن تھے مگر وہ صرف حق وصداقت کے علمبردار ہونے کے ناتے دوستی اور دشمنی کا ایک معیار رکھتے تھے۔۱۹۳۶ء میں غالباً امرتسر میں مرزا بشیر الدین محمود نے جلسہ کرنے کی کوشش کی۔جسے ایک عالم دین کی سرکردگی میں چند جوشیلے مسلمانوں نے الٹ پلٹ دیا۔پولیس نے کارروائی کر کے گرفتاریاں کیں۔مقدمہ عدالت میں گیا تو جج صاحب نے کہہ دیا کہ اگر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے کہہ دیں تو مقدمہ خارج کر دوں گا۔لوگ خوش ہوگئے کہ شاہ صاحب تو اپنے ہیں،وہ کہہ دیں گے۔سید محترم سے رابطہ کیا گیا تو آپ نے آنے والوں سے پوچھا کہ جلسہ شرارتاً تلپٹ کیا تھا یا اسلام کی خدمت میں؟ پھر خود ہی فرمایا کہ دیکھو اگر تو یہ شرارت تھی تو میرا شرارت سے کیا تعلق اور میں شرارت کرنے والوں کی سفارش کیوں کروں؟ اگر انہوں نے اسلام کی خدمت کی ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس ان صعوبتوں کا بہت اجر ہے اور کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں سفارش کر کے انہیں اس اجر سے محروم کر دوں؟ آنے والا وفد اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا۔سید محترم کا نکھرا کردار نہ اپنی ذات کے لیے نہ کسی کے لیے سفارشی سہاروں کا روادار تھا۔

سید مرحوم ومغفور کا یہ تاریخی جملہ جو ایک رات جلسہ عام میں سوتوں کو جگانے کے لیے فرمایا گیا تھا۔ان کی انکساری ،خالق کے ساتھ تعلق کا آئینہ دار ہے۔اپنے مخصوص انداز میں پہلے تین بار فرمایا کہ جب میں خالق کے سامنے پیش ہوں گا تو عرض کروں گا کہ میری جھولی میں وہ کچھ ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔لوگ چونکے۔فرمایا: میں بندہ ہوں میری جھولی میں میری کوتاہیاں ہوں گی تو غفور الرحیم ہے مجھے معاف فرما دے۔